بے ثمر سرما

سردی کی لہر آتی ہے تو ہر شخص گرم کپڑوں اور گرم لحاف کے حصار میں خود کو محفوظ کر لیتا ہے۔ گھروں میں ہیٹر کھل جاتے ہیں۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ حرارت ہماری زندگی ہے۔ جسم میں حرارت ختم تو زندگی ختم۔ یہ حرارت ہماری ہی نہیں ہر جاندار کی زندگی کی ضامن ہے۔ اس حرارت کے بغیر یہ دھرتی ایک منجمد قبرستان بن جائے گی۔

ہمیں اس سرد موت سے بچانا اور کرہ ارض پر زندگی کی حرارت برقرار رکھنا سورج کی ذمہ داری ہے۔ زمین کا کام بس اتنا ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے گھوم کر اپنے ایک ایک انگ کو سورج کے سامنے کر دے اور اطمینان سے سن باتھ لیتی رہے۔ سورج ہر روز اسی طرح خاموشی سے تمام دھرتی کو اپنی حرارت سے زندگی دیتا رہتا ہے۔

اس عظیم کائناتی انتظام سے بے خبر انسان کو چاہیے کہ اور نہ سہی تو یخ بستہ ہوا اور ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں سوچے...... جب گرم کپڑے خریدنے اور گرم ہیٹر جلانے لگے تو سوچے...... لمحہ بھر کو رک کر یہ سوچے کہ سورج اگر واپڈا کی طرح اپنا بل بنا کر بھیجنا شروع کر دے تو کیا ہوگا؟ دن میں چوبیس گھنٹے اور سال میں 365 دنوں کی حرارت کا بل کتنا بنے گا؟ سورج اگر اپنی حرارت بند کر دے تو ہم کتنے دن جی لیں گے؟

جب یہ حساب کتاب کر لیں تو سوچیے کہ اس سورج کو کس نے بلا معاوضہ ہماری اس خدمت پر لگا رکھا ہے۔ اس سوال کا جواب ہماری روح میں ایمان کی حرارت پیدا کر دے گا۔ ہمارا وجود شکر گزاری کے احساس میں ڈھل جائے گا۔ ہمارا دل خدا کی محبت سے سرشار ہو جائے گا۔

ہم یہ سوچیں گے تو یہ سردی ہمارے لیے خداوند رحمٰن کے تعارف کا ایک نیا زاویہ بن جائے گی۔ ورنہ جیسے زندگی کے پچھلے موسم گزرے، یہ موسم سرما بھی بے ثمر گزر جائے گا۔

آخری منزل

7 دسمبر، 2016 کی شام چترال سے اسلام آباد جانے والی فلائٹ ایک حادثے میں تباہ ہوگئی۔ اس جہاز میں سوار 47 انسانوں میں سے ہر انسان اپنے خاندان کے لیے بہت قیمتی تھا، مگر اس سانحے میں جنید جمشید کی رحلت نے پوری قوم کو صدمہ کی کیفیت سے دوچار کر دیا۔

اس طرح کے حادثات انسانوں کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ خاص کر جنید جمشید جیسے معروف اور مشہور افراد اگر ایسے کسی حادثے کا شکار ہو جائیں تو لوگ ایسے واقعات کے اثر سے نکل نہیں پاتے۔ ہر میڈیا اور ہر محفل میں دنوں تک یہی حادثہ زیر بحث رہتا ہے۔

مگر انسانوں کی شاید سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ انسان ایسے واقعات سے وہ سبق نہیں لیتے جو ایسے حادثات میں اصلاً پوشیدہ ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہر انسان اس دنیا میں ایک مسافر ہے اور جلد یا بدیر اس کی سواری موت کے اسی انجام سے دوچار ہونے والی ہے۔ مگر ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم دنیا کی غفلت میں پڑ کر اس انجام کو بھول کر جیتے ہیں۔ ایسے میں کبھی کبھی یہ حادثات پیش آ جاتے ہیں کہ لوگ اس آئینے میں اپنے انجام کو یاد کر لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موت ہم میں سے ہر شخص کی آخری منزل ہے۔ ہم مرد ہوں یا عورت، امیر ہوں یا غریب، ذہین ہوں یا کند ذہن، جنید جمشید ہوں یا ایک عام آدمی؛ موت ہم میں سے ہر شخص کی آخری منزل ہے۔ یہ منزل اگر ہمارے خاتمے کا نام ہوتی تو بہت غنیمت تھا۔ مگر یہ ایک ختم نہ ہونے والی زندگی کا آغاز ہے۔ یہ زندگی ابدی جنت میں گزرے گی یا ابدی جہنم میں۔ ہم موت کی اس منزل اور جنت یا جہنم میں سے کسی ایک انجام سے بچ نہیں سکتے۔

سو اس عظیم حادثے کو یاد کر کے شکر کیجیے کہ ہمارے پاس ابھی موقع ہے کہ ہم ابدی جنت کو اپنا انتخاب بنا لیں۔ اٹھیے اور ایمان و اخلاق کی اس راہ پر قدم رکھیے جس کی منزل جنت ہے۔ قبل اس کے کہ ہماری زندگی کا جہاز بھی موت کی کسی وادی میں گر جائے۔

جہاز کی تباہی اور قوم کی تباہی

پی آئی اے کے جہاز کا گرنا اس کے مسافروں کے لیے موت، لواحقین کے لیے قیامت اور باقی قوم کے لیے سوگ کا باعث بن چکا ہے۔ جنید جمشید کی شخصیت کی وجہ سے میڈیا پر یہ سوگ اور نمایاں اور لوگوں کے لیے یہ سانحہ زیادہ باعث رنج بن گیا ہے۔ مگر گرنے والے جہاز کا یہ سوگ نیا نہیں۔ ہم نے بہت ماتم، بہت سوگ دیکھے ہیں۔ کس کس شخصیت کا نام اور کون کون سے واقعات گنوائے جائیں؟ کوئی دو چار ہوں تو گنوانا بھی اچھا لگے۔

چند دن کا یہ سوگ ہے اور چند دن کی باتیں۔ پھر وہی دن ہوں گے اور پھر وہی راتیں۔ پھر کوئی سانحہ ہوگا، کوئی حادثہ ہوگا، قیمتی انسانی جانوں کا زیاں ہوگا، مرنے والوں کے گھروں میں قیامت آجائے گی، میڈیا کے سدا کے بھوکے پیٹ کو اپنے بھرنے کے واسطے دو چار دن کی خوراک مل جائے گی اور پھر اگلے حادثے تک فراموشی کی کیفیت طاری رہے گی۔

دنیا بھر میں انسان بستے ہیں۔ جہاز، ریل اور گاڑیاں رواں دواں ہیں۔ مگر حادثات اتنے تواتر سے نہیں ہوتے۔ انسانی جان اتنی بے وقعت نہیں ہوتی۔ ہوائی سفر بہت خطرناک ہونے کے باوجود دنیا کا محفوظ ترین سفر ہے۔ برسوں کے تجربے کے بعد مغربی دنیا نے ایسے قوانین وضع کر لیے ہیں کہ اب وہاں شاذ ہی ایسا کوئی واقعہ پیش آتا ہے۔ مگر کوئی ان قوانین پر عمل ہی نہ کرے تو کیا کیا جائے۔ اندازہ کیجیے کہ ہماری تاریخ کے کل سولہ فضائی حادثات میں سے نصف یعنی آٹھ پچھلے تیرہ برسوں میں پیش آئے ہیں۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ ہمارے ہاں حادثات نہیں ہوتے، غفلت کے نتیجے میں پیش آنے والے جرائم ہوتے ہیں۔ یہ غفلت اس ہمہ گیر اخلاقی زوال کا نتیجہ ہے جس کا آج ہمیں سامنا ہے۔

انسانی جانوں کے معاملے میں یہ غفلت مجرموں، دہشت گردوں سے نمٹنے سے لے کر

مریضوں کے غلط علاج تک اور ناقص غذاؤں، جعلی ادویات سے لے کر سڑکوں، ریلوں اور ہوائی جہازوں کے حادثات تک پھیلی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے تیس برسوں سے ہم ایک ہمہ گیر اخلاقی زوال کی طرف گامزن ہیں۔ ہم طالب علموں کے لیے تو قرآن مجید کا بیان ہی کافی ہے، مگر ابن خلدون سے لے کر ٹوائن بی تک جیسے عظیم تاریخ داں اور ماہرین سماجیات بھی گواہی دیتے ہیں کہ اس طرح کے اخلاقی زوال کی آخری منزل عظیم تباہی ہوا کرتی ہے۔

اخلاقی پستی کیا ہوتی ہے، اسے اللہ تعالیٰ سے بہتر اور کون بیان کرسکتا ہے؟ اللہ کے نزدیک اخلاقی پستی عدل، احسان، ایثار کے زوال اور فواحش، منکر، حق تلفی اور ظلم کے فروغ کا نام ہے۔ اپنے فرائض سے غفلت جو ایسے بھیانک حادثات کو جنم دیتی ہے، ان بنیادی اقدار میں سے پہلی یعنی عدل کو بھول جانے کا نام ہے۔ عدل کیا ہے؛ اپنی ذمہ داری، اپنی ڈیوٹی اور اپنے اوپر عاید حق کو پورا پورا ادا کرنا اور اس میں کوئی کوتاہی نہ کرنا۔

ہمارے ہاں دستور ہے کہ ہر معاملے میں حکمرانوں کو برا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لی جاتی ہے، مگر قرآن مجید کے اس معیار کو سامنے رکھیں تو ہم میں سے کون ہے اور کتنے ہیں جو عدل کے تقاضے کما حقہ نبھانے کے عادی ہیں۔ ہمارے ہاں جو بولتے ہیں وہ عدل نہیں کرتے، جو لکھتے ہیں وہ عدل نہیں کرتے۔ صحافی، تاجر، سرکاری ملازم، مزدور، استاد، علما غرض تمام طبقہ ہائے زندگی، عدل کے معیار کے مطابق اپنے فرائض ادا کرنے کے عادی نہیں۔ ہم عدل صرف تب کرتے ہیں جب دوسروں سے لینا ہو، دیتے وقت عدل کرنا ہمارا شیوہ نہیں۔ اپنے لیے ہر شخص کے پاس ایک عذر ہے۔

لیکن ہمیں ہر صورت پر اپنے ہمہ گیر اخلاقی زوال سے نکلنا ہوگا۔ ورنہ جہاز کی تباہی جلد ہی قوم کی تباہی میں بدل جائے گی۔ اس زوال سے نکلنے کا راستہ ایک ہی ہے۔ دوسروں کو چھوڑ دیں اور آج سے اپنے آپ کو خدا کے معیار پر تولنا شروع کر دیں۔ انشاء اللہ یہ زوال رک جائے گا۔

ابلیس کا آلہ کار

قرآن مجید میں بیان کردہ حضرت آدم وابلیس کے قصے میں ایک موقع پر اللہ تعالیٰ ابلیس سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ تجھے کس چیز نے آدم کو سجدہ کرنے سے روکا۔اس کے جواب میں ابلیس یہ کہتا ہے کہ پروردگار تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھے آگ سے پیدا کیا۔

شیطان کی یہ بات غلط نہ تھی۔اللہ تعالیٰ نے بلاشبہ حضرت آدم کو مٹی سے بنایا تھا۔مگر یہ آدھی بات تھی۔باقی آدھی بات یہ تھی کہ حضرت آدم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح میں سے پھونکا۔یہی وہ دوسرا عمل تھا جس نے حضرت آدم کو ایک غیر معمولی ہستی بنادیا تھا۔جس کے بعد وہ مسجود ملائک بنائے جانے کے قابل ہوئے تھے۔مگر ابلیس نے اس روحانی وجود کو بالکل نظر انداز کر دیا اور اس مادی وجود کو بنیاد بنا کر جو اسے کمزور لگا، انھیں سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

اولاد آدم کو اللہ تعالیٰ نے جس اصول پر تخلیق کیا ہے، اس میں وہ بیک وقت مادی اور روحانی پہلو رکھتا ہے۔مگر جب ہر وقت اور ہر جگہ مادی چیزیں زیر بحث آنے لگیں اور روحانی پہلو بالکل نظر انداز ہو جائے تو ابلیسی سوچ عام ہو جاتی ہے۔پھر ہر انسان اپنی مادی کمزوری کو نظر میں رکھتا ہے اور مادی بہتری کو مقصد بنالیتا ہے۔مال، جمال، شہرت، مقام و مرتبہ غرض انھی مادی چیزوں میں دوسروں سے آگے نکلنے کی ایک دوڑ لگ جاتی ہے۔دوسری طرف انسان کی روحانیت جو عدل، احسان، انفاق، صبر، درگزر جیسے اعلیٰ اخلاقی اوصاف کو جنم دیتی ہے کہیں زیر بحث نہیں رہتی۔مادیت کی دوڑ میں انسان تکبر، اسراف، حسد، خودغرضی، بخل اور دیگر اخلاقی رزائل کا شکار ہو جاتا ہے۔آخر کار ایسا انسان ابلیس کا آلہ کار بن جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا ہو یا وہ دنیا انسان کو مسجود ملائک اور جنت کا وارث اس کے روحانی وجود کی وجہ سے بنایا جائے گا۔مادی وجود تو قبر کے گڑھے میں کیڑوں کی غذا بنے گا۔مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو بھولے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ مسجود ملائک سے ابلیس کے پیرو بن جاتے ہیں۔

تعلیم، تحقیق اور ترقی

دنیا میں جو ممالک اس وقت سب سے طاقتور اور مضبوط سمجھے جاتے ہیں، ان کی ترقی کی دو بنیادی اساس ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ معاشی طور پر مستحکم ہوں اور دوسرے وہ فوجی ٹیکنالوجی کے اعتبار سے آگے ہوں۔ ہمارے ہاں مغربی ممالک اور ان کے علاوہ چین، جاپان اور کوریا وغیرہ کا اس پہلو سے ذکر کیا جاتا ہے۔ مگر یہ بات شاذ ہی زیر بحث آتی ہے کہ وہ معاشی اور فوجی طور پر آگے کیسے بڑھ گئے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جو ممالک معاشی طور پر یا فوجی طور پر مستحکم ہیں، ان کے ہاں مسلسل اختراع اور ایجاد و دریافت کا ایک عمل جاری رہتا ہے۔ معاشی طور پر وہ نت نئی مصنوعات بناتے ہیں یا ان کو بنانے کے بہتر سے بہتر طریقے دریافت کرتے ہیں۔ جبکہ فوجی طور پر اسلحہ کی نت نئی ٹیکنالوجی سے وہ اپنی افواج کو لیس کرتے چلے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر امریکہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی فوجی اور معاشی قوت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت بھی امریکہ ایجادات میں ساری دنیا سے آگے ہے۔ پرسنل کمپیوٹر سے لے کر ایپل فون تک دور جدید کی اہم ترین ایجادات امریکہ میں ہوئی ہیں۔ جبکہ فوجی طور پر اس کی ایک مثال ہمارا ایف سولہ جہاز ہے جو امریکہ ہی نے بنایا ہے۔

جن ممالک میں اس وقت زیادہ ایجادات ہو رہی ہیں، اس کا سبب یہ نہیں کہ وہاں کے باشندوں پر الہام ہوتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان ممالک میں شرح تعلیم بہت زیادہ ہوتی ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ ہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو تحقیق کے میدان میں اترتے ہیں اور نت نئے تصورات پر کام کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ تعلیم و تحقیق کا یہی عمل ایجاد و دریافت کا باعث بنتا ہے۔ یہ ایجادات آخر کار فوجی اور معاشی قوت کا سبب بن جاتی ہیں۔

اس پہلو سے اگر ہم اپنے ملک پاکستان کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ بیس کروڑ آبادی کے اس ملک میں تعلیم اور شرح خواندگی انتہائی کم ہے۔ یونیسکو کے مطابق 55 فی صد شرح خواندگی کے ساتھ پاکستان کا نمبر دنیا میں 160 ہے۔ جبکہ اعلیٰ تعلیم کا حال یہ ہے کہ ملک کی آبادی کا بمشکل پانچ فی صد حصہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔

یہ بھی بہت غنیمت ہوتا کہ اگر یہ اعداد و شمار اصل صورتحال کی عکاسی کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں تعلیم کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ اکثر و بیشتر ایک فراڈ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس ملک میں جو ڈگری آپ چاہیں گھر بیٹھے حاصل کریں۔ جو لوگ کسی طرح تعلیم کا بوجھ ڈھوتے ہیں وہ بھی نقل اور دیگر ذرائع سے پاس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کسی اعلیٰ یونیورسٹی میں پاکستانی ڈگریوں کو تسلیم نہیں کیا جاتا اور بین الاقوامی سطح پر منعقد ہونے والے مختلف امتحانات پاس کر کے طلبا کو اپنی قابلیت کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔

یہ ہے وہ صورتحال جس میں ہمارے ملک میں تعلیم کا بجٹ صرف دو فی صد ہے۔ اور ہمارا خیال یہ ہے کہ سی پیک جیسے منصوبوں سے اپنی تقدیر بدل دیں گے۔ اس طرح کے منصوبوں کی افادیت ضرور ہوتی ہے۔ ان سے اور اچھی معاشی پالیسیوں سے عارضی طور پر کسی ملک کی معیشت میں بہتری آسکتی ہے۔ مگر کوئی ملک دنیا میں مستقل طور پر ترقی کر جائے اور دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہو اس کا ایسے منصوبوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس دنیا میں دیرپا ترقی اور اپنی افرادی قوت کا حقیقی فائدہ اٹھانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ ملک میں تعلیم اور تحقیق کا چلن عام ہو۔ ہمیں اس بات کو سمجھنا ہوگا، وگرنہ ہم دیکھتے رہ جائیں گے اور دنیا کی دیگر اقوام ہی نہیں بلکہ ہمارے خطے کی اقوام بھی ہم سے بہت آگے نکل جائیں گی اور ہم غربت و جہالت کی دلدل میں دھنسیں رہیں گے۔

دورِ تشکیک اور قرآن

دورِ جدید زمانی اعتبار سے دو ادوار میں تقسیم ہے۔ ایک دور وہ ہے جس کا خاتمہ بیسویں صدی کے ساتھ ہوا۔ اس دور میں عقل اور چرچ کے بیچ ایک زبردست معرکے کے بعد عقلیت کو فتح حاصل ہوئی اور چرچ کے ساتھ خدا کے تصور کو بھی رد کر دیا گیا۔ چنانچہ اس دور تک انسان کو یقین ہوگیا کہ دنیا میں ساری برائی کی جڑ مذہب تھی جس سے ہم نے جان چھڑالی ہے۔ چنانچہ ایک طرف مغربی معاشروں سے حکومتی اور معاشرتی سطح پر مذہب اجنبی ہوگیا اور دوسری طرح کمیونزم کی فتح کے بعد سوویت یونین میں خدا کے بالجبر انکار پر قائم ایک جابرانہ حکومت قائم ہوگئی۔

تاہم بیسوی صدی کے نصف اول میں دو عظیم جنگوں میں مرنے والے کروڑوں لوگوں اور سوویت یونین میں اسٹالن کے اقتدار میں قتل کیے جانے والے کئی ملین لوگوں کی لاشیں اٹھانے کے بعد انسانیت کو یہ احساس ہوا کہ دنیا جتنی بری مذہب کے ساتھ تھی، اس سے زیادہ بری مذہب کے بعد ہو چکی ہے۔

چنانچہ مذہب کو ایک دفعہ پھر افراد کی حد تک قبول کرلیا گیا اور آج کے دن تک یہ رجحان بڑھ رہا ہے۔ تاہم یہ مذہب اب کسی حقیقت یہ سچائی کا نام نہیں ایک ثقافتی مظہر ہے جسے زیادہ سے زیادہ ایک انسانی ضرورت کہا جاسکتا ہے۔ اس مذہب میں خدا کو مانا جاتا ہے، کچھ مراسم عبودیت بھی ادا کر دیے جاتے ہیں، مگر عملی زندگی کے ڈھانچے میں اس کی بالجبر مداخلت گوارا نہیں کی جاتی۔ یعنی خدا ہے تو سہی مگر اس لیے کہ ڈپریشن میں اس کے سامنے رو لیا جائے اور مصیبت میں اس کو پکار لیا جائے۔

باقی اس کا کوئی حکم بہرحال ماننے کی ضرورت نہیں۔ ہاں دل چاہے، جب چاہے اور جتنا چاہے خدا یا مذہب کی بات مانی جاسکتی ہے۔ اگر فلسفے کی زبان مستعار لی جائے تو کہا جاسکتا کہ

ہے۔

Religion is no more a True Justified Belief but Just a belief

یعنی مذہب عقل کی کسوٹی پر پورا اترنے والا کوئی مسلمہ نہیں رہا بلکہ محض ایک عقیدہ ہے۔ چنانچہ یہیں سے صحیح وغلط مذہب کی بحث اب ختم ہوچکی ہے اور تمام مذاہب درست ہیں کا نظریہ عام ہوگیا ہے۔ چنانچہ لوگ نظریاتی طور پر خدا کو مان رہے ہوتے ہیں، مگر عملاً نہیں مانتے۔ خدا کو مان کر نہ ماننے کی یہ کیفیت تشکیک (Skepticism) کہلاتی ہے۔ یہ عملاً دنیا کے تمام پڑھے لکھے لوگوں کی عمومی کیفیت ہے۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ کچھ متعصب لوگوں کو چھوڑ کر جو آج بھی ہر قسم کی نامعقول باتوں کو ماننے کے لیے تیار ہوں جیسے یہ زمین چھ ہزار سال قبل وجود میں آئی، مذہب کے ساتھ تشکیک عام ہوچکی ہے۔ جن لوگوں کو سائنسی نظریات کا علم ہوجاتا ہے یا وہ ان کو سننے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں وہ انکار خدا تک پہنچ جاتے ہیں اور باقی لوگ زندگی اس طرح گزارتے ہیں کہ مذہب کو بس کچھ خاص دائرے تک محدود سمجھتے ہیں اور وہی احکام مانتے ہیں جو ان کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس سے باہر وہ کچھ بھی ماننے کے لیے تیار نہیں۔

اللہ تعالیٰ جو انسانوں کے خالق و مالک ہیں، ان کو مستقبل میں پیش آنے والے اس واقعے کا پہلے سے علم تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہ اہتمام کیا کہ مذہبی تاریخ میں پہلی دفعہ قرآن کی شکل میں ایک ایسی کتاب نازل کی جو نازل زرعی دور کے قبائلی سماج میں ہوئی تھی، مگر یہ کتاب دین کے تمام بنیادی عقیدوں پر عقلی استدلال سے بھری ہوئی ہے۔ اس استدلال کو سمجھ لیا جائے تو انسان خود بخود شک سے نکل کر True Justified Belief یا حق الیقین حاصل کرلیتا ہے۔ قرآن کے اس استدلال کو دنیا تک پہنچانا آج کرنے کا سب سے بڑا کام ہے۔

ابو یحییٰ

ارتقا اور تخلیق

ایمانیات اور فلسفہ و سائنس

تقریباً ایک دہائی قبل اس خاکسار نے ایک عام فرد کے لیے دین کی لازمی تعلیم کا ایک نصاب ترتیب دیا تھا۔ یعنی وہ دینی علم جس کا جاننا ہر فرد کے لیے ضروری ہے۔ کچھ عرصہ قبل میں نے اس نصاب کو پڑھانا شروع کیا اور اس میں سے اخلاقیات کا حصہ اپنی کتاب ''قرآن کا مطلوب انسان'' کی روشنی میں الحمدللہ پڑھا دیا۔ یہ چوبیس لیکچرز پر مشتمل ایک سیریز تھی جس کے ساتھ اضافی طور پر بنیادی عربی زبان کی ابتدائی تعلیم بھی دی گئی تھی۔ اب یہ دونوں کورسز میری ویب سائٹ inzaaor.org پر طالب علموں کے لیے دستیاب ہیں۔

اب انشاء اللہ میرا ارادہ ہے کہ میں اس نصاب کا دوسرا حصہ پڑھاؤں جس کا تعلق ایمانیات اور ان کے دلائل سے ہے۔ قرآن مجید پر میرے تحقیقی کام کے ذیل میں جو کہ ''مضامین قرآن'' کے نام سے میرے رسالے میں ہر ماہ شائع ہوتا ہے، اس کے بہت سے مباحث ''دلائل قرآن'' کے عنوان سے زیر بحث آ چکے ہیں۔ ایمانیات کے دلائل پر پہلی دفعہ لکھتے وقت اور اب ان کی تدریس سے قبل میں نے فلسفہ، الحاد اور ارتقا جیسی چیزوں کا مطالعہ ساتھ ساتھ شروع کر رکھا ہے۔ کیونکہ یہ خاکسار اصلاً قرآن مجید کا طالب علم ہے، اس کے مباحث ہمہ وقت ذہن میں تازہ رہتے ہیں، لیکن فلسفہ و سائنس کی چیزیں اپنی جزئیات میں چونکہ مستحضر نہیں رہتیں، اس لیے ان کو ذہن میں تازہ کر لینا ضروری ہوتا ہے۔

اس کا ایک اضافی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ خود اپنے نقطہ نظر کا دوبارہ جائزہ لینے کا بھی موقع مل جاتا

ہے۔ نیز کچھ اہم چیزیں الگ سے زیر بحث آجاتی ہیں۔ آج اسی حوالے سے نظریہ ارتقا پر کچھ گفتگو پیش نظر ہے۔ خاص کر اس پہلو سے کہ اس کا قرآن مجید کے نظریہ تخلیق سے کیا تعلق ہے۔

نظریہ ارتقا اور وجود باری تعالیٰ

نظریہ ارتقا چارلس ڈارون (1882-1809) نے اپنی کتاب On the Origin of Species میں سن 1859 میں پیش کیا۔ اس نقطہ نظر کے مطابق زندگی سادہ ترین شکل میں شروع ہوئی اور پھر مختلف انواع ارتقائی عمل سے گزرتی ہوئی نیچرل سیلیکشن کے اصول پر جنم لیتی گئیں اور آخر کار انسان کی شکل میں اس کرہ ارض پر غالب ہو چکی ہیں۔

جس دور میں ارتقا کا یہ نظریہ سامنے آیا، اس دور میں یورپ کے سوچنے والے لوگ مسیحی چرچ کے جبر کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑ رہے تھے۔ چرچ مذہب کی جس روایت کا علمبردار تھا اس میں حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ زمین کائنات کے مرکز میں واقع تھی۔ بشپ جیمس اوشر (1656-1581) کی بائبل پر تحقیق کے مطابق تخلیق کا واقعہ چھ ہزار برس قبل ہوا۔ یہی نقطہ نظر تمام مسیحی دنیا میں مقبول تھا۔

یہ ساری باتیں جو مسلمات کے نام پر پیش کی جاتی تھیں، مذہب کی ایک بالکل غلط نمائندگی تھیں۔ ان میں سے کئی باتیں مثلاً زمین کا مرکز کائنات ہونا کوپرنیکس اور گلیلیو بالکل غلط ثابت کر چکے تھے، مگر چرچ اپنی اصلاح کے لیے تیار نہ تھا۔ آخر کار جب نظریہ ارتقا پیش ہوا تو گویا یہ انسانوں کی تحریفات سے آلودہ مذہب کے کفن میں آخری کیل ثابت ہوا۔ سوچنے سمجھنے والے تمام اذہان نے مذہب کو ماننے سے انکار کر دیا۔

نظریہ ارتقا اور ڈارون کے اسی کام کی اہمیت کے پیش نظر ڈارون کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے خدا کو ختم کر دیا اور اسی پس منظر میں جرمنی فلسفی فرائڈرچ نے 1882 میں یہ نعرہ بلند

کیا کہ خدا مر چکا ہے۔

God is dead

ارتقا اور تخلیق

اس کے جواب میں مسیحی اہل علم نے یہ موقف اختیار کیا کہ ارتقا کا نظریہ غلط اور بے اصل ہے اور تخلیق کا نظریہ درست ہے۔ زندگی ارتقا سے وجود میں نہیں آئی بلکہ خدا نے اسے تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ تقریباً پچھلے ڈیڑھ سو برسوں سے ارتقا بمقابلہ تخلیق ایک معرکہ بپا ہے۔ ملحدین ارتقا کے نظریے کو خدا کے رد کی بنیاد سمجھتے ہیں، جبکہ مسیحی مفکرین ارتقا کا رد کر کے تخلیق کے نظریے کو زندگی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ انواع کے وجود میں آنے کا معاملہ چونکہ لاکھوں برس پہلے واقع ہوا اس لیے اس بات کے حق میں براہ راست دلیل کسی گروہ کے پاس نہیں ہے کہ یہ ہوا کیسے۔ جو دلائل ہیں وہ بالواسطہ اور استنباطی ہیں اور ایسے دلائل سے اختلاف کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ تاہم زیادہ تر لوگوں کے لیے اب مذہب کی کوئی حقیقی بنیاد باقی نہیں رہی ہے۔

پچھلے ڈیڑھ سو برسوں میں یہ فکری معرکہ مغرب ہی میں برپا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی ہمارے ہاں کتب بینی کا رجحان بہت کم ہے اور خاص کر علمی مطالعہ تو ناپید ہے۔ اسی لیے عام طور پر جدید سماجی اور سائنسی تصورات سے ہم لوگ بالکل ناواقف ہیں۔ تاہم انٹرنیٹ کی ایجاد کے بعد دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے جس میں یہ ممکن نہیں کہ نئے تصورات لوگوں تک نہ پہنچیں۔ مزید یہ کہ انٹرنیٹ اپنی نوعیت کی بنا پر لوگوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور پڑھ لیں۔ چنانچہ لوگوں نے ان چیزوں کو پڑھنا شروع کیا اور اب یہ سارے تصورات ہمارے ہاں پھیل گئے ہیں۔

تخلیق اور تسویہ

یہی وہ پس منظر ہے جس میں ہمارے ہاں بھی ارتقا بمقابلہ تخلیق کی ایک فکری جنگ شروع

ہوگئی ہے۔ تاہم اس معاملے میں اسلام کے ایک طالب علم کے طور پر ہم ایک اصولی چیز کو واضح کرنا چاہیں گے۔ ارتقا بمقابلہ تخلیق کا تصور اصل مسیحی علم کلام کا تصور ہے۔ اسلام میں ارتقا کی کوئی نفی نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید کے مطابق تخلیق کے ساتھ ایک دوسرے مرحلے کا بھی ذکر کرتا ہے جسے وہ تسویہ کہتا ہے یعنی کسی چیز کا مختلف مراحل اور شکلوں سے گزر کر بہترین مطلوبہ شکل تک پہنچے کا عمل، (الاعلیٰ 2:87)۔ اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو ارتقا کے تحت بیان کردہ جو چیزیں مسلمہ حقائق کی حیثیت رکھتی ہیں انھیں تسویہ کے ذیل میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کے بارے میں بھی قرآن میں چھ دن میں زمین و آسمان کی پیدائش کا تصور دے کر یہ واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چیزوں کو ارتقائی عمل سے گزار کر مطلوبہ شکل تک پہنچاتے ہیں۔ خیال رہے کہ قرآن کے چھ دن سے مراد صبح و شام کا سلسلہ نہیں بلکہ چھ مراحل یا زمانے ہیں۔ قرآن دن کو اس معنی میں بھی استعمال کرتا ہے۔

قرآن کا کلمہ ''کن''

ہمارے ہاں یہ تصور عام ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو کلمہ ''کن'' (یعنی ہو جا) کہہ کر پیدا کرتے ہیں اور اس کلمے کے کہتے ہی وہ چیز فوراً پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ درست تصور نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر چیز اللہ کے حکم سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن قرآن مجید میں آنے والے ''کن فیکون'' کے الفاظ کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ نے کہا ہو جا تو کوئی چیز فوراً ہو جاتی ہے۔

''کن فیکون'' کے الفاظ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی اس تخلیق کے ضمن میں بیان کرتا ہے جو کائنات میں جاری معمول کے قوانین سے ہٹ کر کی جاتی ہے۔ یعنی جب طبعی اور حیاتیاتی قوانین کے برعکس یا اس سے ہٹ کر کوئی تخلیقی عمل سرانجام پاتا ہے تو یہ اس کا بیان ہوتا ہے۔ عام تخلیق اللہ تعالیٰ کے اس وسیع تر انتظام کا حصہ ہے جس کے تحت وہ عام طریقے پر کائنات کا نظام

چلا رہے ہیں اور جس کو قرآن مجید تدبیر امور (رعد 2:13) سے تعبیر کرتا ہے۔

جبکہ ''کن فیکون'' کی تعبیر غیر معمولی واقعات کے لیے ہوتی ہے۔ جیسے مردوں کا دوبارہ زندہ ہونا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تعبیر اختیار کی ہے۔ خود زمین و آسمان کی پہلی دفعہ تخلیق کے ضمن میں بھی اس کو بیان کیا گیا ہے کہ ظاہر ہے اس وقت نہ عام طبعی قوانین موجود تھے نہ ان کے مطابق کچھ ہوسکتا تھا۔ اس خصوصی تخلیق میں ایک چیز اور قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ سردست اس بات کی وضاحت مقصود ہے کہ قرآن مجید میں یہ تو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پیدا کی اور اس کا تسویہ کیا، مگر یہ نہیں بتایا کہ اس کا طریقہ کار یا میکنزم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ تخلیق انسانوں کے سامنے ہوتی ہے، اس کا میکنزم وہ پہلے ہی جانتے ہیں۔ کسی چیز کے بارے میں سائنس کچھ اور بتادیتی ہے تو یہ چیز اسلام کے تصور تخلیق کے خلاف نہیں۔ قرآن صرف یہ بتاتا ہے کہ ہر چیز اللہ نے پیدا کی، ایک ارتقائی عمل سے پیدا کی اور بعض اوقات وہ عمومی قانون سے ہٹ کر بھی اپنی قدرت سے کچھ چیزیں پیدا کردیتے ہیں۔

ارتقا اور خدا

اس پہلو سے اسلام کی ارتقا سے کوئی جنگ نہیں۔ بلکہ اگر ارتقا علم کے مسلمات پر ایک درست نقطہ نظر ثابت ہو بھی جائے تب بھی زیادہ سے زیادہ اسے خدا کے طریقہ تخلیق کا ایک حصہ سمجھا جائے گا۔ یہ نہ خدا کے تصور کو رد کرسکتا ہے نہ خدا کے بدل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ زمین و آسمان کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ اگر آج سائنس یہ بتاتی ہے کہ زمین کس طرح وجود میں آئی تو اس سے وجود باری تعالیٰ کی نفی کیسے ہوجاتی ہے؟ اسی طرح سائنس اگر اس دھرتی پر حیات کے وجود میں آنے کا کوئی میکنزم، نظریہ ارتقا کے عنوان سے بیان کرتی ہے تو اس نظریے سے خدا کے وجود کی نفی کیسے ہوجاتی ہے؟ کم از کم اس خدا کی نفی تو نہیں ہوتی جس کا تصور قرآن

مجید عطا کرتا ہے۔ بلکہ یہی کہا جائے گا کہ سائنس نے تسویے کے اس عمل کی تفصیل بیان کر دی جسے قرآن مجید نے کسی چیز کی پہلی تخلیق کے بعد کا عمل قرار دیا تھا۔ بلکہ ایک دوسرے پہلو سے تو نظریہ ارتقا خدا کے وجود کو ہی کو ثابت کرتا ہے۔

ہم نے اس حوالے سے ایک مضمون ''ارتقا اور خارجی رہنمائی'' لکھا تھا جواب ہماری کتاب ''ملاقات'' کا حصہ ہے۔ اس مضمون میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ اس دنیا میں جتنا کچھ بھی ارتقا ثابت ہے، وہ چونکہ اپنی توجیہہ کے لیے ہر جگہ خارجی رہنمائی کا محتاج ہے، اس لیے وہ اصلاً خدا کے وجود کو ثابت کرتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ارتقا کو فطرت کی اندھی طاقتوں کے حوالے سے سمجھا جائے گا تو بنیادی سوال تشنہ رہ جائے گا لامحدود کائناتی عوامل جو زندگی کے لیے موت کی حیثیت رکھتے ہیں، کیوں اس کرہ ارض پر آ کر زندگی کو وجود میں بھی لاتے ہیں اور برقرار بھی رکھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہاں قدم قدم پر خارجی مداخلت یا رہنمائی ہے جو زندگی کو وجود میں لاتی ہے اور اسے برقرار بھی رکھتی ہے۔ تاہم خدا کو نہ ماننے والے اسے فطرت یا نیچر کا نام دے دیتے ہیں۔ اور اس عمل کو نیچرل سیلیکشن کہہ دیتے ہیں۔ مگر یہ ایک مکمل طور پر لایعنی بات ہے۔

خدا کے مقابلے میں ایک نئی دیوی

قدیم دور میں لوگ مختلف بتوں کی پرستش کرتے تھے اور کائنات میں کارفرما مختلف عوامل جیسے بارش، پیداوار وغیرہ کو بتوں کی کارفرمائی قرار دیتے تھے۔ اس دور میں لوگوں نے مدر نیچر (Mother Nature) کے نام سے ایک دیوی کو تخلیق کیا ہے۔ وہ سارے کام جو زمانہ قدیم میں مشرکین اپنے بتوں سے لیا کرتے تھے، آج کے ملحدین وہی سارے کام اس دیوی یعنی مدر نیچر سے لیتے ہیں۔ چنانچہ ارتقا کے بیان میں جہاں کہیں کوئی ایسا موڑ سامنے آتا ہے جس کی کوئی

توجیہہ نہیں کی جا سکتی، یہ لوگ اسے نیچر کے کھاتے میں ڈال کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ اس پر ہمارا سوال یہی ہے کہ مدر نیچر جو ایک اندھی بہری طاقت ہے کس طرح زندگی جیسی پیچیدہ اور انسان جیسی بامعنی تخلیق کو وجود میں لا سکتی ہے۔

اس کے جواب میں ایک لایعنی گفتگو شروع ہو جاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقی طور پر یا حادثاتی طور پر ہوا ہے۔ اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ پھر ڈکشنری میں اتفاق اور حادثہ کی تعریف بدل دینا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ کرہ ارض پر موجود زندگی بہت زیادہ پیچیدہ ہے اور اس کرہ ارض کی عمر اتنی کم ہے کہ خالص بخت و اتفاق کی بنیادوں پر اتنی پیچیدہ زندگی کو وجود میں لانے کے لیے کھربوں برس پرانی زمین بھی ناکافی ہے۔ اس لیے یہاں اگر ارتقا ہے تو اس کے ساتھ ہر قدم پر خدا کی رہنمائی موجود ہے۔ جس کی بنا پر یہ ارتقا وہ میکنزم بن جاتا ہے جو آخر کار ایک بامعنی زندگی اور زندگی کو برقرار رکھنے والے نظام کو جنم دیتا ہے۔

انسان کی ابتدائی تخلیق

تاہم اس میں بھی یہ بات واضح رہنا چاہیے کہ تخلیق کے کسی میکنزم کی تخلیق کے بعد بھی اللہ تعالیٰ مجبور نہیں ہو گئے ہیں کہ اس سے ہٹ کر وہ کچھ اور نہ پیدا کر سکیں۔ موجودہ تخلیقی میکنزم چاہے وہ عالم جمادات میں ہو یا عالم حیات میں ان کے کلمہ ''کن'' ہی سے پیدا ہوا ہے۔ ''کلمہ کن'' اصل میں ان کی قدرت کا استعارہ ہے۔ اسے جب چاہے وہ استعمال کر کے سارے قانون کو بالائے طاق رکھ کر جب چاہیں جو چاہیں پیدا کر دیں۔ کچھ چیزوں کا تذکرہ اس ضمن میں ہم پیچھے کر چکے ہیں اور انھی خصوصی تخلیقات میں سے ایک خود حضرت انسان کی ابتدائی تخلیق ہے جو قرآن مجید کی وضاحت کے مطابق اللہ کے کلمہ کن سے ہوئی (ال عمران 59:3)۔

قرآن واضح کرتا ہے کہ انسان کی تخلیق کا آغاز اللہ تعالیٰ نے براہ راست مٹی سے کیا۔ ظاہر

ہے کہ اس کی براہ راست تردید یا تصدیق کا کوئی ذریعہ انسانیت کے پاس نہیں ہے۔ آج کے دن تک سائنس اس بات کی براہ راست تردید نہیں کرسکی کہ ابتدائی انسان کا خمیر براہ راست مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ اس لیے کہ یہ واقع ہزاروں یا شاید لاکھ دو لاکھ برس پہلے پیش آیا ہوگا۔

دوسری طرف ارتقا کو خدا کی تخلیق کا بدل ماننے والوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان بندروں سے بتدریج ترقی پا کر انسان بنا۔ اس کے ثبوت میں وہ مختلف انسانی ڈھانچے پیش کرتے ہیں جو ان کے خیال میں بندر سے انسان تک کے بیچ کی درمیانی کڑیاں ہیں۔ مزید یہ کہ سائنس یہ کہتی ہے کہ موجودہ نسل انسانی کی تخلیق کا واقعہ بائبل کی بیان کردہ مدت یعنی چھ ہزار سال قبل سے بہت پہلے پیش آیا تھا۔ چنانچہ ان ارتقائی ڈھانچوں کی دریافت اور چھ ہزار سال سے کہیں پہلے انسان کی تخلیق کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ سائنس نے بائبل کی تردید کردی ہے۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں اعتراضات قرآن کریم پر وارد نہیں ہوتے۔ قرآن نے بائبل کی طرح انسانی پیدائش کی چھ ہزار برس کی کوئی تاریخ براہ راست یا بالواسطہ نہیں دی۔ ہاں قرآن مجید مٹی سے انسان کی تخلیق کو تخلیق کا پہلا اور ابتدائی مرحلہ قرار دیتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو موجودہ سائنس علم کے بیان سے مختلف ہے، مگر جیسا کہ اوپر بیان ہوا سائنس قرآن کے اس بیان کی تردید نہیں کرسکتی۔ مگر اس کے بعد جس دوسرے مرحلے کو وہ بیان کرتا ہے سائنس خود کو اس سے زیادہ دور محسوس نہیں کرتی۔ ہم جیسا کہ آگے واضح کریں گے کہ ان ڈھانچوں کی توجیہہ تسویہ کے اس دوسرے مرحلے سے کی جاسکتی ہے جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔

انسانی تخلیق کا طریقہ کار

اس بات کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید میں بیان کردہ انسانی تخلیق کے مراحل کو سمجھنا ہوگا۔ قرآن مجید سورہ سجدہ کی آیات 7 تا 9 میں انسان کی تخلیق کے تین مراحل بیان کرتا ہے۔

الف۔ پہلے مرحلے پر براہ راست مٹی سے نوع انسانی کی تخلیق کا آغاز ہوا۔
ب۔ دوسرے مرحلے میں اس نوع میں جنسی تعلق کی صلاحیت پیدا کی گئی اور نسل انسانی توالد وتناسل کے اصول پر آگے بڑھنا شروع ہوئی۔
ج۔ ان دونوں مراحل تک انسان وہ انسان نہیں تھا جو اللہ تعالیٰ کے پیش نظر تھا بلکہ انسان کے حیوانی قالب کی تشکیل کا عمل تھا۔ چنانچہ تیسرے مرحلے پر بتدریج اس حیوانی قالب کے نوک پلک سنوارے گئے اور اسے درست کر کے وہ متناسب جسم اور شکل عطا کی گئی جو اس وقت موجود ہے۔

اس عمل کے دوران میں جب وہ انسان وجود میں آ گئے جو جسمانی طور پر مطلوب تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے دو مرد و زن کو الگ کر کے ان میں روح پھونکی۔ اس خدائی روح کے اثر سے انسان میں عقل و شعور کی وہ تمام تر صلاحیتیں جمع ہوگئیں جن کی مدد سے انسان زمانہ قدیم میں ایک نسبتاً کمزور جسم کا مالک ہونے کے باوجود مشکل ترین حالات کا مقابلہ کر کے اپنی نوع کو بچانے میں کامیاب ہوگیا بلکہ آنے والے دنوں میں دھرتی کا حکمران بن گیا۔ جبکہ نوع انسانی کے قدیم لوگ اس روح کی محرومی کی وجہ سے مرتے چلے گئے۔ انھی کے ڈھانچے ہیں جو سائنسدانوں کو ملتے رہتے ہیں اور وہ اسے ارتقا کا ایک ثبوت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ نوع انسانی کے اپنے ارتقا کے مراحل ہیں نہ کہ بندروں اور انسانوں کے بیچ کی کڑیاں ہے۔

انسان ایک خصوصی تخلیق

ارتقا کو ایک عقیدہ بنا لینے والوں کا یہ صرف ایک قیاس ہے کہ انسان ارتقا کی سیڑھی پر بندروں سے ایک قدم آگے کی مخلوق ہے اور کچھ نہیں۔ انسان کو ترقی یافتہ جانور ثابت کرنے والے لوگوں کے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں کہ انسان جانوروں سے ترقی پا کر انسان بنا ہو۔ بلکہ واضح ترین

قرائن اس کے بالکل برعکس ہیں اور قرآن مجید کی تائید کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان باقی جانداروں سے صرف ایک قدم آگے نہیں کھڑا ہوا بلکہ انسان اور دیگر انواع میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ موجودہ انسان جسے Homo Sapiens کہا جاتا ہے بہت کم عرصہ قبل اس دھرتی پر وجود میں آیا، لیکن جب وجود میں آیا تو تھوڑے ہی عرصے میں پورے کرہ ارض پر چھا گیا۔ یہ انسان تعداد میں بہت کم تھا پھر بھی کائناتی حوادث کا مقابلہ کر گیا جبکہ انسان کی قسم کی باقی انواع معدوم ہوگئیں۔ سوال یہ ہے کہ انسان اگر اسی انداز کا ایک مزید ترقی یافتہ جانور ہے تو پھر صرف انسان نے یہ کام کیوں کر دیا؟ کیوں باقی اقسام میں سے کوئی اور یہ کام نہیں کر سکا؟ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ قرآن مجید کی یہ بات بالکل درست ہے کہ انسان اللہ کی ایک خصوصی تخلیق ہے۔

یہی نہیں بلکہ انسانوں کے اندر جو ایک وجدان، ذوق جمال، فہم و ادراک، اپنی نوع کے ساتھ مکالمہ اور جڑے رہنے کی غیر معمولی صلاحیت، خیر و شر کا اخلاقی تصور اور روحانیت کا جو شعور پایا جاتا ہے اور جس کے مجموعے کو Behavioral modernity کہا جاتا ہے، یہ کہاں سے آیا۔ اس بات کی ایک توجیہہ یہ کی جاتی ہے کہ اس صلاحیت کا ماخذ انسانی دماغ ہے جو دیگر جانداروں کے مقابلے میں بڑا ہے۔ مگر یہ بات اس لیے درست نہیں کہ نینڈرتھل (Neanderthal) جو کہ انسانوں سے قریب کی ایک مخلوق تھی، ان کا دماغ انسانوں سے بڑا تھا۔ مگر وہ معدوم ہوگئے حالانکہ وہ تعداد میں زیادہ تھے، جسمانی طاقت میں بھی زیادہ تھے اور موجودہ انسان سے کہیں پہلے سے اس دنیا میں موجود تھے اور زیادہ تجربہ کار تھے۔ مگر نہ وہ بچے نہ انسان سے ملتی جلتی کوئی اور نوع بچ سکی۔

علت اور معلول (Cause and Effects)

تاہم کوئی کسی طرح اس بات کی مزید کوئی توجیہ کر بھی لے تب بھی حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام

توجیہات صرف اس سوال کا جواب دیتی ہیں کہ کوئی چیز کیسے ہورہی ہے۔یعنی How it is happening?۔ یہ سوال کہ Why is it happening? سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ یہ سوال عام حالات میں شاید اتنا اہم نہ ہومگراس کرہ ارض پر زندگی کو وجود میں لانے کے لیےتمام کائناتی طاقتیں جو عام حالات میں زندگی کوقتل کردینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں جیسے سورج کی حرارت وغیرہ، مکمل ہم آہنگی کے ساتھ کام کررہی ہیں۔ان کائناتی طاقتوں کا اس کررہ ارض پر آکرایک خاص رویہ اختیارکرلینا اور پھر یہاں اتنی بامعنی زندگی کا موجود ہونا، یہ لازم کرتا ہے کہ بتایا جائے کہ یہ سب کچھ کیوں ہورہا ہے۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں ہرافیکٹ کا ایک کاز ہوتا ہے، وہاں یہ بات نہیں مانی جاسکتی ہے کہ یہ سب کچھ بغیر کسی کرنے والے کے ہورہا ہے۔ یہ خدا کا انکارنہیں، اپنے عقل وشعوراور وجدان و بصیرت کا انکار ہے۔ یہ اس کائنات کا انکار ہے جو ہمارے سامنے موجود ہے۔اس انکار کے بعد واقعی انسان دو ٹانگوں پر چلنے والا جانور کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ جانور دورشرک میں بھی پائے جاتے تھے اور موجودہ دورالحاد میں بھی پائے جاتے ہیں۔

جہاں رہیے بندگان خدا کے لیے رحمت بن کررہیں، باعث زحمت نہ بنیے ۔

ابو یحییٰ

منافقت کیا ہے؟

سوال:

السلام علیکم

سر میرا سوال منافقت کے بارے میں ہے کہ منافقت کیا ہے اور میں کیسے جان سکتا ہوں کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہوں۔ اور اگر میں منافقت کی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہوں تو میں اس بیماری کا علاج کیسے کر سکتا ہوں۔ جیسا کہ مشہور مقولہ ہے کہ پرہیز علاج سے بہتر ہوتا ہے تو وہ کون سی چیزیں ہیں جن کو اختیار کر کے منافقت کی بیماری سے بچا جا سکتا ہے۔

براہِ کرم رہنمائی فرمایئے تاکہ میں خود کو منافقت سے بچا سکوں۔

اور آپ سے درخواست ہے کہ میرے لیے دعا فرمایئے کہ میں قرآن اور دین کو درست طریقے پر سمجھ سکوں اور کامیاب ہو سکوں۔ آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔

محمد دانش فضل

جواب:

محترمی و مکرمی دانش فضل صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

منافقت اس بات کا نام ہے کہ انسان دل سے ایمان کا منکر ہو لیکن اپنے ظاہر سے اس بات کا اظہار کرے کہ گویا وہ ایک مسلمان ہے۔ اگر عقلی طور پر اسلام کو دین حق سمجھتے ہیں اور دل سے اس کی تصدیق کرتے ہیں اور پھر آپ علانیہ طور پر اس کا اقرار بھی کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ

کوئی بھی شخص خود کو منافق سمجھے۔ دین کی تعلیم یا اعتقاد پر کسی قسم کا سوال پیدا ہونا یا عملی طور پر کسی کمزوری کا ظہور ہونا منافقت نہیں ہوتا۔

منافقت کی بیماری وہاں جنم لیتی ہے جہاں انسان ظاہری طور پر تو اسلام کا اقرار کرنے پر مجبور ہوتا ہے، مگر دل سے وہ حق کا منکر ہوتا ہے۔ اس طرح کا شخص اپنی منافقت کو کوئی بیماری نہیں سمجھتا وہ اسے حالات کا تقاضہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ آپ کا یہ سوال درست نہیں ہے کہ مجھے منافقت کی بیماری لاحق ہو تو اس کا کیا علاج ہے۔ منافق کو اپنا رویہ کبھی بیماری محسوس نہیں ہوتا۔

ہاں بعض روایات میں منافق کی کچھ نشانیاں بیان ہوئی ہیں جیسے بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے وغیرہ۔ یہ اس دور کے منافقین کی عام علامات تھیں۔ مومن صادق میں اس طرح کی چیزوں کا کوئی امکان نہیں۔ اگر ہو تو اسے پوری قوت سے اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ سچ بولے اور وعدہ پورا کرے۔

یہ چیزیں ضعف ایمان کی علامت ہوتی ہیں۔ یہ منافقت میں اس وقت بدلتی ہیں جب آدمی پورے شعور سے اپنے غلط رویے کو درست سمجھے اور پھر اصلاح کی فکر کرنے کے بجائے گناہوں کی تاویل کرنا شروع کر دے۔ یہ منافقت ہے، اس کا علاج سوائے توبہ کے کچھ نہیں۔

کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' دنیا کے لیے ایک تحفہ ہے۔ لیکن میرا سوال یہ ہے کہ اس میں ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ نمایاں کیوں نہیں کیا گیا؟

نوشین عباسی

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محترمہ نوشین عباسی صاحبہ

کتاب کی پسندیدگی کے لیے آپ کا شکریہ۔

جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو یہ ایک فطری سوال ہے جو بہت سے لوگوں نے مجھ سے کیا کہ کیوں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض دیگر مذہبی شخصیات کو اس کتاب میں نمایاں نہیں کیا۔ دیکھیے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میں ایک ناول کے قالب میں چیزوں کو بیان کررہا ہوں۔ ناول میں آپ کو مکالمات لکھنے ہوتے ہیں۔ اس کے بغیر آپ شخصیات کو زیادہ بیان نہیں کرسکتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی کو بھی میں اگر بیان کرتا تو پھر مکالمات لکھنے پڑتے۔ اس معاملے میں چونکہ ہمارے ہاں لوگ بے حد حساس ہیں تو اس بات کا شدید اندیشہ ہوتا کہ کوئی فتنہ پرور کوئی فتنہ نہ پیدا کردے اور اصل مقصد فوت ہوجائے۔ اس لیے میں نے اس سے احتراز کیا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ روز قیامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت یا دیگر انبیا کی شخصیت نمایاں نہیں ہوگی۔ میں نے مرکزی کردار کا احوال لکھا ہے۔ اس لیے اس کو نمایاں کرنا پڑا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جو مقام انبیائے کرام کا ہے وہ تو قیامت ہی کے دن پوری طرح نمایاں ہوگا۔ امید ہے بات واضح ہوگئی ہوگی۔

ڈاکٹر شہزاد سلیم / محمود مرزا

نابینا مشق

آنکھیں اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک نعمت ہیں۔ ہم اکثر ان کی قدر نہیں کرتے۔ جبکہ ان لوگوں کے لیے یہ انتہائی تکلیف دہ تجربہ ہوتا ہے جو یہ نعمت رکھتے ہیں اور پھر نابینا ہو جاتے ہیں، خاص طور پر جب کوئی علاج ممکن نہ ہو۔ پیدائیشی نابینا افراد کے لیے بھی یہ کوئی کم آزمائش کی بات نہیں ہوتی ہے۔

اس حقیقت کو باور کرانے کے لیے کہ یہ آنکھیں ہم پر خدا کا کتنا بڑا احسان ہیں، ہم یہ کر سکتے ہیں کہ چند منٹوں کے لیے اپنی آنکھیں بند رکھیں اور پھر اپنے روزمرہ کے معاملات سرانجام دینے کی کوشش کریں۔ یہ تجربہ ہمارے لیے انتہائی پریشان کن ثابت ہوگا۔

ٹھوکر کھانے کے ڈر کے ساتھ چند قدم ہی چل سکنا، بمشکل تمام پانی کا ایک گلاس پینا، انتہائی مشکل سے بیت الخلا کو استعمال کرنا، رنگ اور مناسبت سے بالکل ناواقف رہ کر کپڑے تبدیل کرنا، موٹر سائیکل اور گاڑی کو چلانے کا سوال ہی پیدا نہ ہونا، یہ وہ چند مسائل ہیں جو ہم کو فوری طور پر درپیش ہو جائیں گے۔ مزید یہ کہ ہم اس قابل تک نہ رہتے ہیں کہ اپنے گردوپیش، یہاں تک کہ اپنے آپ کو دیکھ سکیں۔

یہی تو وہ آنکھوں کا تحفہ ہے جو ہمارے پاس ہے اور ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم وقتاً فوقتاً اس نابینا مشق کو کرتے رہیں تاکہ مسلسل اپنے آپ کو اس بات کا احساس دلا سکیں کہ ہم کتنے خوش قسمت ہیں۔ ہم ان بے شمار چیزوں کی محرومی کا شکوہ کرتے ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہوتی ہیں۔ کیوں نہ ان نعمتوں کو گِنا جائے جو ہمارے پاس ہیں اور کیوں نہ اس گنتی کا آغاز آنکھوں سے کیا جائے جو ہماری دنیا کو منور کر دیتی ہیں۔

فرح رضوان

سب سے بڑا مرض

ماں جی! آپ تو ہر بات سے ہی روک دیتی ہیں۔شازیہ نے اچھے خاصے جھلائے لہجے میں ماں جی سے شکوہ کیا تو جواباً وہ خاموش ہی رہیں۔

ذرا دیر گذرنے پر شازیہ کو اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہوا تو اس نے ان سے معذرت تو کی، لیکن ساتھ ہی اپنی شکایت دہراتے ہوئے پھر ان سے پوچھا:

ماں جی! شانی آنٹی سے میری ساری سہیلیوں کو اتنا پیار ہے،اور مسلمان سے اگر اللہ کی خاطر محبت کی جائے تو اسے تو بتانا بھی چاہیے۔ہاں کہ نہ؟

اس نے ماں جی سے اپنی بات کی تصدیق چاہی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دینے پر ہی اکتفا کیا۔شازیہ نے پوچھا

پھر جب شانی آنٹی نے آج درس ختم کیا اور سب لوگ ان سے اپنے اپنے حساب سے بے لوث محبت کا اظہار کر رہے تھے،تو آپ کیوں خود بھی پیچھے رہیں اور مجھے بھی ادھوری بات کے بیچ میں ٹوک کر بات کا رخ کیوں موڑ دیا؟،

جملہ ختم کرتے ہوئے شازیہ کافی جذباتی اور روہانسی ہو چلی تھی۔

لہٰذا ماں جی نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا:

دیکھ پتر !انسان کی اچھائی سے محبت ہونا برا نہیں، بلکہ برا، محبت میں اندھا ہونا ہے، کیونکہ اس رویے سے انسان اپنا اور اس بندے کا جس سے وہ اندھی محبت کرتا ہے دونوں ہی کا بہت نقصان کر دیتا ہے۔کیونکہ ہولے ہولے سے یہی رویہ اندھی تقلید اور شخصیت پرستی میں بدل جاتا ہے۔ یاد ہے ناں کہ انسانی تاریخ میں سب سے پہلے شرک کی شروعات اسی شخصیت پرستی سے ہی تو

شروع ہوئی تھی، جب لوگوں نے صالح لوگوں کے دنیا سے چلے جانے کے بعد پہلے ان کی تصویریں تو بعد میں بت بنا لئے تھے کہ یہ ہمیں رب سے جوڑنے کا سبب ہیں۔

آج کتنے ہی مشہور نام ہیں جن کو سادہ لوح افراد مختلف قسم کے مذہبی القابات سے پہچانتے ہیں۔ جو مذہب ہی کے نام پر اپنے مداحوں کو اللہ سے دور لے جا رہے ہیں۔ کون ہے جو رہبر کے بھیس میں چھپے ان رہزنوں کو ان کی حرکتوں پر روک ٹوک سکے؟ اور یہ رہزن مداحوں کی اندھی، ناروا محبت اور خود ان شخصیات میں شہرت و ناموری کی نہ مٹنے والی بھوک و پیاس نے ہی تو جنم دیئے ناں!

کچھ دیر خاموشی رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے وہی بولیں:

ہر قسم کی ہی بھوک پیاس آزمائش ہے شازیہ پتر! زیادہ مل جانا بھی، تھوڑا مل جانا بھی اور سرے سے نہ ملنا بھی ......اللہ تعالیٰ آزمائش کی سختی اور آفتوں کی مشقت سے ہم سب کو بچائے۔

شازیہ جو ابھی تک خاموشی اور غور سے ماں جی کی باتیں سن رہی تھی، ان کے خاموش ہونے پر بولی لیکن ماں جی! ان سب باتوں کا شانی آنٹی والی بات سے کیا تعلق؟ وہ تو بالکل بھی ایسی نہیں ہیں۔

اس پر ماں جی ہنستے ہوئے بولیں یاد ہے شازیہ! پرسوں صائمہ کے گھر اس کی پرانی تصویروں کے البم دیکھ رہے تھے تو کتنا ہنس رہے تھے سارے کہ آج جو موٹی موٹی خالہ تائی اماں، اتنے موٹے پھوپھا صاحب ہیں کبھی وہ سب کس قدر دھان پان تنکے جیسے دبلے پتلے ہوا کرتے تھے۔ تو سوچ تو سہی پتر! کل کو کون کیسا ہو جائے گا یا کس کا خاتمہ کس حال میں ہوگا؟ ہمیں تو کچھ نہیں نا خبر! پھر بھی محبت کے مارے ہر کوئی شانی جی سے یہی بولے جا رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کے جیسا بنا دے، اور شانی جی بھی ان کو اس وقت نہیں ٹوک رہی تھیں۔ تب میں نے تمہیں روکنا مناسب سمجھا کہ تم اس شخصیت پرستی سے دور رہو۔ یہ سب سے بڑا مرض ہے۔

شمائلہ عثمان

بچت

پچھلے دنوں ایک عزیز کے انتقال میں جانے کا موقع ملا مرحوم کی عمر تو بہر حال تھی لیکن کچھ عرصے پہلے تک بھی وہ چاق و چوبند اور اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر بہت فخر سے بھرپور زندگی گزار رہے تھے اور صاحب حیثیت ہونے کے سبب متعلقہ لوگوں کو بھی پابند کیا ہوا تھا کہ جیسا وہ چاہیں وہی صحیح ہے ویسا ہی کرنا ہے۔ آس پاس موجود رشتوں میں محبت تو تھی لیکن ان کی ناراضی اور بے وقت نامناسب غصے کے اظہار کا خوف غالب رہتا تھا۔ اولاد سے لے کر ملازم تک سب ان کے اصولوں کے پابند تھے۔ بے شک ان کی زندگی کسی بادشاہ وقت سے کم نہ تھی۔

بہر حال بادشاہ ہو یا فقیر انجام سب کا یکساں ہے۔ سب کو بے یارو مددگار دنیائے فانی سے دنیائے باقی کی طرف چار لوگوں کے کندھوں پر اپنے سفر کا آغاز کرنا ہے۔ سب کو ہی کفن اور دو گز زمین کے علاوہ کچھ نہیں ملنا۔ یہاں سے جانے والی دنیا کی حد ختم اور نہ ختم ہونے والی زندگی کی طرف سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں پتہ چلتا ہے کہ اس نے جنتی بن کر بادشاہوں سے بھی اونچا مقام حاصل کرنا ہے یا ہمیشہ ذلیل وخوار ہونے والا جہنمی۔ یہاں سے خاندان رتبہ اور روپے پیسے اختیار و اقتدار کا کھیل ختم اور نامہ اعمال کی بنیاد پر درجوں کا تعین شروع۔ یہاں انسان کی بچت کا وہ اکاؤنٹ شروع ہوتا ہے جس نے اس کی اگلی زندگی کے اسٹیٹس کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ اکاؤنٹ انسان کے دنیا میں آتے ہی کھل جاتا ہے۔ جو شخص اس میں عبادتوں کے ساتھ ساتھ ایثار، قربانی، صلہ رحمی، دیانت، ہمدردی، خلوص، صبر، شکر، نرمی، نیک نیتی، انصاف، بہترین صلاحیتوں کا مثبت اور بھرپور استعمال اور وسائل و اختیارات کے معاملے میں خدا خوفی کے بیج بوئے گا وہ آخرت میں اس کی ہی فصل کاٹے گا۔ اور جو شخص بھرپور عبادتوں کے باوجود جھوٹ،

ریاکاری، بددیانتی، ظلم، ناانصافی، غرور، تکبر، حرام کاری، صلاحیتوں، وسائل اور اختیارات کا ناجائز استعمال کے بیج لگائے گا آخرت میں وہی خار دار جھاڑیاں قدم قدم پر اس کو منہ کے بل گرائیں گی۔

دنیا کی زندگی کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ اکاؤنٹ کلوز ہوجائے گا اور اس کا پروفٹ قبر کے گھر سے ہی شروع ہوجائے گا۔ کسی کے لیے یہ قبر اندھیری کوٹھری یا جہنم کا گڑھا اور کسی کے لیے جنت کا دروازہ۔ بے شک قبر کا حال تو صاحب قبر ہی جان سکتا ہے کہ وہ اپنی بچت کا کیا پروفٹ پا رہا ہے۔ اس بچت کے تمام اصول قرآن پاک کی ہدایت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں واضح کردیئے گئے ہیں۔ بس تیاری آج سے ہی شروع کرنی ہے پھر کل ہو یا نہ ہو یا ہم کل ہوں یا نہ ہوں۔

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (35)

دین کی بنیادی دعوت: سنن الٰہی اور اسرار و حِکم

دین کی بنیادی دعوت کے باب میں ہم کم و بیش تمام مباحث کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ دین کی بنیادی دعوت کا پہلا موضوع ایک اللہ کی ذات پر ایمان، اس کی بندگی اور ساتھ میں شرک اور غیر اللہ کی بندگی کی نفی تھا۔ اس کے بعد ذات باری تعالیٰ کے تعارف کا سلسلہ شروع ہوا اور اس ذیل میں ہم ذات و صفات کا جائزہ لے چکے ہیں۔ اس سلسلہ کلام کے آخر میں اب انشاء اللہ ہم سنن الٰہی اور اسرار و حِکم پر بات کریں گے۔ سنن الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی دنیا کو کن اصولوں پر چلا رہے ہیں۔ جبکہ اسرار و حِکم سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ حکمتیں ہیں جو عام طور پر انسانوں سے پوشیدہ ہوتی ہیں، تاہم نزول قرآن مجید کے وقت اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض پر پردہ اٹھا کر ہمیں ان سے مطلع کر دیا۔

سنن و اسرار کے بیان کی وجہ

سنن الٰہی اور اسرار و حِکم کے بیان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی دنیا میں انسانوں کو اختیار و ارادہ دے کر بھیجا ہے، جو مکمل طور پر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور جہاں ہر طرف اسی کا حکم چل رہا ہے۔ مگر دوسری طرف انسان تکوینی طور پر خدا کا پابند بھی ہے۔

اس بات کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو انسانوں کے اس دنیا میں بسائے جانے کی اسکیم سے آگاہ کیا تو یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ اس دھرتی پر ایک خلیفہ یعنی صاحب اختیار و صاحب اقتدار ہستی کو مقرر کر رہے ہیں۔ چنانچہ اب

صورتحال یہ ہے کہ اس دنیا میں ایک طرف انسان ہیں جو دیگر مخلوقات کے مقابلے میں زمین پر ہر طرح سے غلبہ واقتدار رکھتے ہیں۔ یہاں انسان ہر پہلو سے خود کو آزاد دیکھتا ہے۔ اس آزاد اور خودمختار انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کی خودمختاری کا لحاظ کرتے ہوئے معاملہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انبیا ورسل بھی آتے ہیں وہ کسی مادی جبر کے بغیر اخلاقی بنیادوں پر انسانوں کے سامنے اپنی دعوت رکھتے ہیں۔ جس کا قبول کرنا یا رد کرنا کلی طور پر انسانوں کے اختیار میں ہوتا ہے۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی اپنی ہستی ہے جو کائنات کا پورا انتظام چلا رہی ہے۔ ساری کائنات اس کے حکم پر عمل کرنے کی پابند ہے۔ کسی مخلوق کے لیے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اس پہلو سے وسیع تر کائناتی اسکیم میں انسانوں پر بھی اللہ ہی کا حکم چلتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں پہلوؤں کو جب سامنے رکھا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں ایک بہت مشکل حسابی مساوات جنم لیتی ہے۔ ایک طرف خدا ہے جو قادر مطلق ہے اور کائنات کا فرمانروا ہے۔ دوسری طرف انسان ہے جسے زمین پر صاحب اختیار اور صاحب اقتدار بادشاہ بنایا گیا۔ اس کے بیچ میں خدا اور انسان کا وہ تعلق ہے جس میں انسانوں کے پاس خدا کا پیغام بھی آتا ہے اور ان کو اس پیغام کو قبول یا رد کرنا ہے۔ جس کے بعد خدا کو بھی انسان کے ساتھ جوابی معاملہ کرنا ہے۔

چنانچہ یہی وہ پس منظر ہے جس میں اللہ تعالیٰ انسانوں کو یہ بتاتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں کس طرح اور کن بنیادوں پر انسانوں کے ساتھ معاملہ کر رہے ہیں۔ اس پہلو سے یہ علم ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے ذریعے سے انسان نہ صرف خدا کی معرفت درست طور پر حاصل کرسکتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ اپنے معاملے کو بھی مکمل طور پر درست رکھ سکتا ہے۔ یعنی انسان جان سکتا ہے کہ ہم کیا کریں گے تو جواب میں خدا کیا کرے گا۔ یہ اس دنیا میں دیا جانے والا سب سے بڑا علم

ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح رہے کہ سنن و اسرار کا یہ علم مادی کائنات سے نہیں، انسانوں سے متعلق ہے۔قرآن مجید کے یہ الفاظ کے تم سنت الٰہی میں تبدیلی نہیں پاؤ گے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے ساتھ اسی اصول پر معاملہ کریں گے۔ یہ نہیں کہ مادی کائنات کو جن قوانین پر انھوں نے بنایا، وہ ان میں تبدیلی نہیں کرسکتے۔ عام مادی قوانین میں تو وہ جب چاہیں مداخلت کرکے ان کو بدل دیں۔مادی قوانین اوران سے متعلق سنن قرآن مجید کا نہیں طبعیات کا موضوع ہیں۔قرآن مجید کی سنن و اسرار کا تعلق انسان سے ہے۔

سنن الٰہی

سنن الٰہی سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ معاملات ہیں جو اللہ تعالیٰ افراد و اقوام کے ساتھ مستقل طور پر کرتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ان میں سے اہم ترین سنن کا مختصر بیان درج ذیل ہے۔ان کی تفصیل استاذ گرامی کی کتاب میزان کے باب ایمانیات میں دیکھی جاسکتی ہے۔

1۔ابتلاء: اس دنیا میں ہر انسان کا امتحان ہورہا ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے اچھے برے معاملات امتحان کا حصہ ہوتے ہیں۔

2۔ہدایت و گمراہی: اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں فطرت انسانی، انفس و آفاق کی نشانیوں اور انبیا و رسل کی رہنمائی کی شکل میں انسانوں کی ہدایت کا پورا انتظام کررکھا ہے، تاہم ہدایت کی توفیق وہ انھی کو دیتا ہے جو دل و دماغ کو کھلا رکھتے اور سماعت و بصارت کو استعمال کرکے خود کو اس کا اہل ثابت کرتے ہیں۔اپنی خواہشات اور تعصّبات میں مبتلا لوگوں کے دلوں پر اللہ کی طرف سے مہر لگادی جاتی ہے۔

3۔قابل عمل شریعت: ہدایت قبول کرنے کے بعد جو احکام و مطالبات ان کے سامنے رکھے

جاتے ہیں، وہ ان کی برداشت سے زیادہ نہیں ہوتے۔ شریعت کا کوئی حکم انسانی استعداد سے زیادہ نہیں۔ اسی اصول پر شریعت میں ہر جگہ ضعیف اور معذور لوگوں کے لیے ہر پہلو سے رعایتیں ہیں۔

4۔ اقوام کا محشر: افراد کے برعکس جن کی حتمی سزا و جزا آخرت کے دن ہوگی، اقوام کا محشر یہ دنیا ہے۔ قوموں کے ساتھ ان کے عملی، علمی اور اخلاقی رویے کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ قوموں کا عروج و زوال اسی میں پوشیدہ ہے۔

5۔ اجتباء و نصرت الٰہی: اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت دنیا تک پہنچانے کے لیے لوگوں کا اجتباء یا انتخاب کرتے ہیں۔ پھر جن لوگوں کو یہ مشن تفویض کیا جاتا ہے، ان کی مدد بھی کی جاتی ہے۔ مگر یہ مدد صبر اور تقویٰ سے مشروط ہوتی ہے۔

6۔ توبہ و استغفار: جو لوگ احکام الٰہی کی خلاف ورزی کر بیٹھیں، ان کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے۔ یہ توبہ تاہم ان کے لیے نہیں جو عمر بھر گناہ کریں اور پھر موت کو سامنے دیکھ کر توبہ کریں۔

7۔ سزا و جزا: انسانوں کی سزا و جزا کا اصل دن قیامت ہی ہے۔ تاہم رسولوں کی بعثت کے بعد ان کی اقوام کی سزا و جزا اسی دنیا میں برپا کی جاتی ہے۔ کفر کی پاداش میں قوم کو ہلاک کیا جاتا ہے اور ایمان لانے پر ان کو بچا لیا جاتا ہے اور زمین کا وارث بنا دیا جاتا ہے۔ یہی ضابطہ آل ابراہیم کے لیے ہے کہ ان کے اعمال بد پر ان پر اسی دنیا میں قومی مغلوبیت مسلط کی جاتی ہے اور اچھے اعمال پر اسی دنیا میں انھیں اجتماعی غلبہ دیا جاتا ہے۔

اسرار و حکم

اس دنیا میں انسان تنہا مخلوق نہیں۔ دیگر مخلوقات بھی موجود ہیں۔ قرآن مجید نے ان کے حوالے سے بھی کچھ نہ کچھ معلومات انسانوں کو دی ہیں اور ساتھ میں نظام کائنات کے حوالے سے

بھی کچھ رموز کھولے ہیں۔ مثلاً سورہ کہف میں حضرت موسیٰ کے قصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح اس دنیا کے معاملات مختلف مصالح کے تحت چلائے جاتے ہیں جن میں اچھے لوگوں کو بظاہر نقصان اور برے کو فائدہ ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے، لیکن حقیقت برعکس ہوتی ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے خدا کی حمد و تسبیح کرتی ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی طرح جنوں کے ساتھ بھی معاملات کررہے ہیں۔ یہ بتایا گیا ہے کہ شیاطین کی ایک دنیا ہے جس میں وہ ہدایت پر چلنے والوں کی راہ میں روڑے اٹکاتے اور برائی کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ شیاطین کے سردار ابلیس نے انسانوں کے باپ آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا اور ان کی اولاد کو گمراہ کرنے کا عزم کیا تھا۔ ان چیزوں کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ انسان ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرے اور نامساعد حالات سے گھبرا کر ہمت نہ ہار دے۔

قرآنی بیانات

''پس یہ نہیں انتظار کررہے ہیں مگر اسی سنتِ الٰہی کا جو اگلوں کے باب میں ظاہر ہوئی۔ تو تم سنتِ الٰہی میں نہ کوئی تبدیلی پاؤ گے اور نہ تم سنتِ الٰہی کو ٹلتے ہی ہوئے پاؤ گے۔''
(فاطر 35:43-42)

''اور یاد کرو جب کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، انھوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے اور ہم تو تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہی ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہی ہیں؟ اس نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔'' (البقرہ 2:30)

''اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے۔ اس نے انکار کیا اور گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے بن گیا۔ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی دونوں رہو جنت میں اور اس میں سے کھاؤ فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے بن جاؤ گے۔ تو شیطان نے ان کو وہاں

سے پھسلا دیا اور ان کو نکلوا چھوڑا اس عیش و آرام سے جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے کہا کہ اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے لیے ایک وقت خاص تک زمین میں رہنا بسنا اور کھانا بلسنا ہے۔ پھر آدم نے پا لیے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات تو اس نے اس کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (البقرہ 2:37-34)

''جس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو تا کہ تمہارا امتحان کرے کہ تم میں کون سب سے اچھے عمل والا بنتا ہے۔ اور وہ غالب بھی ہے اور مغفرت فرمانے والا بھی۔'' (الملک 67:2)

''ہر جان کو موت کا مزا لازماً چکھنا ہے۔ اور ہم تم لوگوں کو دکھ اور سکھ دونوں سے آزمارہے ہیں پرکھنے کے لیے اور ہماری ہی طرف تمہاری واپسی ہونی ہے۔'' (الانبیاء 21:35)

''اور وہ لوگ جنھوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی اللہ نے ان کی ہدایت میں افزونی بخشی اور ان کے حصہ کی پرہیز گاری ان کو عطا فرمائی۔'' (محمد 47:17)

''ہمارا کام ہدایت دینا ہے۔'' (اللیل 92:12)

''اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر ایک پائے گا جو کمائے گا اور بھرے گا جو کرے گا۔

اے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہم سے مواخذہ نہ فرمانا۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر اس طرح کا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ لاد جس کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہمیں معاف کر، ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما، تو ہمارا مولیٰ ہے، پس کافروں کے مقابل میں ہماری مدد کر۔'' (البقرہ: 2:286)

''اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کرلے اور جب اللہ کسی قوم پر کوئی آفت لانے کا ارادہ کر لیتا ہ تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی اور ان کا اس کے مقابل میں کوئی بھی مددگار نہیں بن سکتا۔''، (الرعد 13:11)

''اے ایمان والو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم اچھی طرح جمائے گا۔'' (محمد 47:7)

''اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری تو انہی کے لیے ہے جو جہالت سے مغلوب ہو کر برائی کا

ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں، وہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ اور ان لوگوں کی توبہ نہیں ہے جو برابر برائی کرتے رہے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو بولا کہ اب میں نے توبہ کر لی اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو کفر ہی پر مرجاتے ہیں۔ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''
(النساء4:18-17)

''اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے تو جب ان کا رسول آجاتا ہے ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔'' (یونس10:47)

''ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ بے شک وہ بڑا ہی حلم والا اور بخشنے والا ہے۔'' (بنی اسرائیل17:44)

''اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول اور نبی بھی بھیجا تو جب بھی اس نے کوئی ارمان کیا تو شیطان نے اس کی راہ میں اڑنگے ڈالے۔ پس اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں کو، پھر اللہ اپنی باتوں کو قرار بخشتا ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں کو ان لوگوں کے لیے فتنہ بنائے جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو سخت دل ہیں اور بے شک یہ ظالم اپنی مخاصمت میں بہت دور نکل گئے ہیں۔''
(الحج22:53-52)

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (39)

آرٹون کی متوقع خوبصورتی کے باعث ہمارا ارادہ تھا کہ یہاں بھی ایک دو دن رکیں گے مگر اس شہر کے امپریشن نے ہمارے خواب چکنا چور کر دیے تھے چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ آگے چل کر کہیں رکا جائے۔ اب ہم دریائے چوروح کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگے۔ کچھ دور جا کر ایک عجیب منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ دریا کے دونوں طرف پہاڑوں کو کھود کر انہیں ایک پیالے کی شکل دی گئی تھی۔ درمیان میں دریا بھی کہیں کہیں چٹانوں کے اندر غائب ہو رہا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ یہاں ماہرین نے دریا کو سرنگوں میں سے گزار کر بجلی پیدا کرنے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ کچھ دور جا کر سبزہ غائب ہو گیا۔ اب ہم چٹیل پتھریلے پہاڑوں کے بیچ میں سفر کر رہے تھے اور دریائے چوروح ہمارے ہمراہ تھا۔ اس پہاڑی سلسلے کو "کچکار" کہا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ پہاڑ خوفناک ہوتے جا رہے تھے۔ ہم اب ایک تنگ و تاریک درے میں داخل ہو چکے تھے۔ بعض مقامات پر تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ پہاڑ جیسے سر پر آ گرے گا۔ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً لینڈ سلائیڈنگ کی صورت میں جگہ جگہ پہاڑ سڑک پر آ گرا تھا۔ ایک مقام پر تو باقاعدہ گاڑیاں لائن میں رکی ہوئی تھیں۔ اتر کر اگلی گاڑی سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ یہاں ابھی تازہ تازہ سلائیڈنگ ہوئی ہے اور ہائی وے ڈیپارٹمنٹ نے گاڑیوں کو روکا ہوا ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ عین ہمارے گزرنے کے وقت سلائیڈنگ نہیں ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد سڑک صاف ہوئی تو یہاں سے روانگی ہوئی۔

کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک دوراہے پر جا پہنچے۔ یہاں سے ایک سڑک قریب ہی واقع قصبے "یوسف علی" کی طرف جا رہی تھی۔ یہ مقام "دریائی رافٹنگ" کے لئے مشہور ہے۔

رافٹنگ ایسا کھیل ہے جس میں ربڑ کی کشتیوں پر بیٹھ کر تیزی سے بہتے ہوئے پہاڑی دریا میں کشتی رانی کا شوق پورا کیا جاتا ہے۔ میرا بھی ارادہ تھا کہ اس کھیل کا تجربہ کر کے دیکھا جائے مگر اس وقت یہاں ایسے کوئی آثار نہ تھے۔ سنا ہے کہ ہمارے ہاں بھی شمالی علاقوں میں فوجی جوان یہ کھیل کھیلتے ہیں مگر عوام میں یہ کھیل مقبول نہیں ہے۔

یوسف علی کے قریب ایک سروس اسٹیشن پر نماز ادا کرنے کے بعد ہم نے اگلے شہر "ارض روم" کی طرف رخ کیا۔ یہاں سے دریا کی دو شاخیں ہو رہی تھیں۔ ایک تو یوسف علی کی جانب سے آ رہی تھی اور دوسری ارض روم کی طرف سے۔ تھوڑی دور جا کر ہمیں "ٹورٹم آبشار" کا بورڈ نظر آیا چنانچہ میں نے اسی طرف گاڑی موڑ لی۔

ٹورٹم آبشار

پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے ہم آگے بڑھے۔ اس مقام پر لگے ایک تعارفی بورڈ میں ٹورٹم کو ترکی کا سب سے قیمتی قدرتی خزانہ قرار دیا گیا تھا۔ یہاں ایک وسیع وادی تھی جس میں دریائے چوروح ایک پرسکون ندی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اچانک دریا کے راستے میں کئی سو فٹ گہری کھائی آ جاتی ہے اور دریا اس کے اوپر سے ایک بہت بڑی آبشار کی صورت میں نیچے گرتا ہے۔ اسی کا نام ٹورٹم آبشار تھا۔

آبشار کے دونوں جانب نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان سیڑھیوں کی تعداد کم از کم 200 تو ہو گی۔ یہ آبشار واقعتاً ترکی کا سب سے قیمتی قدرتی خزانہ تھی۔ یہاں پانی چار حصوں میں تقسیم ہو کر نیچے گر رہا تھا۔ درمیان کے دو حصوں میں پانی زیادہ تھا جبکہ کناروں پر پانی کم تھا۔

ہم ایک طرف کی سیڑھیوں سے نیچے اترنا شروع ہوئے۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے تو آبشار کا

ایک مختلف زاویے سے جائزہ لیا۔ بالکل نیچے پہنچ کر آبشار ایک بڑے سے تالاب میں گر رہی تھی۔ اس تالاب سے پانی چھلک کا دوبارہ ندی کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ یہی ندی آگے جا کر دریائے چوروح میں مل رہی تھی۔

یہاں بعض ترک پتھروں پر قدم رکھتے ہوئے آبشار کے قریب جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم نے اس کوشش سے پرہیز کیا کیونکہ پانی کی وجہ سے پتھر کافی چکنے ہو رہے تھے اور ذرا سی غلطی سے ہم تیز بہتی ہوئی ندی میں گر سکتے تھے۔ آبشار سے اڑنے والی پانی کی پھوار دور تک پھیل رہی تھی۔

کچھ دیر یہاں گزار کر ہم نے واپسی کے لئے دوسری جانب کی سیڑھیوں کا انتخاب کیا۔ اوپر پہنچے تو صورتحال مختلف ہو چکی تھی۔ اب ہم ندی کے دوسری جانب تھے۔ یہاں ندی پر سکون تھی۔ یہی ندی آہستہ آہستہ پہاڑی کے کنارے کی طرف جا رہی تھی جہاں سے یہ یک دم پوری قوت سے آبشار کی صورت میں نیچے گر رہی تھی۔ اس مقام پر ندی کو پار کرنے کے لئے پتھر رکھ کر راستہ بنایا گیا تھا جس پر سے گزر کر ہم واپس پارکنگ میں پہنچ گئے۔ یہاں کچھ ریستوران بنے ہوئے تھے۔ اب شام ہو رہی تھی لہذا ہم نے فیصلہ کیا کہ جلد از جلد ارض روم کی طرف روانہ ہوا جائے تاکہ دن کی روشنی کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جا سکے۔

کچھ دور جا کر ہم ایک بہت بڑی جھیل پر پہنچ گئے۔ یہ ٹورٹم جھیل تھی۔ سنہرے پہاڑوں کے درمیان اس جھیل کا نیلا پانی خوب صورت منظر پیش کر رہا تھا۔ جھیل کافی بڑی تھی اور سڑک اس کے کنارے پر چل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد مغرب ہو گئی اور اندھیرا پھیلنے لگا۔ سڑک اب کافی چوڑی ہو چکی تھی۔ یہاں سنگل سڑک کے بیچ میں ایک لین بنا دی گئی تھی جو کہ اوورٹیکنگ کے لئے استعمال ہو سکتی تھی۔ اب ہم "ارض روم" کے قریب ہوتے چلے جا رہے تھے۔

ارض روم، ڈوغو بایزید اور کوہ ارارات

ارض روم پہنچے تو یہ ایک عجیب شہر خموشاں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ابھی عشاء کی اذان ہو رہی تھی اور پورا شہر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں ہوٹل ڈھونڈنا نہیں پڑا۔ جلد ہی سڑک کے کنارے ایک ہوٹل نظر آیا جس کے نیچے ریستوران بھی بنا ہوا تھا۔ ہوٹل میں داخل ہوئے تو ریسپشن پر مامور صاحب نماز پڑھ رہے تھے۔ ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ نیچے موجود ریستوران میں داخل ہوئے تو ماحول کچھ ایرانی سا لگا۔ اس سے پہلے اہل ترکی مجھے "پاشا" کہہ کر پکار رہے تھے، ایران سے قربت کے باعث یہاں انہوں نے مجھے "آغا" قرار دیا۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر ایک باریش ترک بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا۔ اب کھانے کے انتخاب کا مسئلہ تھا۔ سامنے تھال میں کھانے سجے ہوئے تھے۔ سوچ سمجھ کر سبزی گوشت کا انتخاب کیا جو کہ درست ثابت ہوا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ہمارے ہی کھانوں کی ابتدائی شکل ہو جس سے ارتقاء کرتے کرتے موجودہ پاکستانی سالن وجود میں آیا ہو۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں ہوٹل میں کمرہ لینے کے لئے گیا۔ ریسپشن پر موجود صاحب کی نماز ابھی جاری تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے کمرہ دکھایا جہاں ہمیں رات گزارنا تھی۔

ارض روم مشرقی ترکی کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ بھی ایک قدیم شہر ہے جس کی تاریخ 4000 قبل مسیح تک جاتی ہے۔ شہر کے نام کی وجہ یہ ہے کہ جب مسلم حکومتوں نے مشرقی اناطولیہ کا علاقہ فتح کیا تو ان کی سرحدیں اس شہر پر آ کر رک گئیں۔ اس زمانے میں یہ رومی سلطنت کا آخری شہر ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی اور فارسی میں اسے "ارض روم" یعنی روم کی سرزمین کا نام دے دیا گیا۔ اپنی سرحدی لوکیشن کی وجہ سے یہ شہر تاریخ میں ہمیشہ جنگوں کا مرکز بنا

رہا ہے۔ابن بطوطہ کے دور میں یہاں سلجوقیوں اور تاتاریوں کے درمیان جنگ کے نتیجے میں یہ شہر تباہ ہو گیا تھا۔اپنے سفر نامے میں موصوف لکھتے ہیں:

ہم مڑ کر ارزوروم (ارض روم) شہر پہنچے۔ یہ عراق کے شہروں میں سے ایک شہر ہے جس کا رقبہ بہت زیادہ ہے۔اس کا اکثر حصہ اس فتنہ کے باعث تباہ ہو چکا تھا جو کہ ترکمان کے دو گروہوں کے مابین واقع ہوا۔ اس میں سے تین دریا گزرتے ہیں۔ اس کے اکثر حصے پر باغات پھیلے ہوئے ہیں۔

ترکی کے باقی حصوں کی طرح ارض روم میں بھی صبح بہت جلد ہو گئی۔ ناشتے کے طور پر ایک بیکری سے پنیر کے پیٹز لئے۔ میں چونکہ دوپہر کے کھانے میں صرف پھل کھاتا ہوں، اس لئے ایک پھلوں کی دکان سے ڈھیر سارے انگور، خوبانیاں اور آڑو بھی خریدے۔اب میرے پاس ترکش لیرا ختم ہو رہے تھے۔ایک بینک ڈھونڈ کر یہاں سے لیرا حاصل کرنے کے بعد ہم شہر سے نکلنے کو تیار ہو گئے۔

فتح اللہ گولان

ارض روم کی مشہور شخصیات میں محمد فتح اللہ گولان شامل ہیں۔آپ ایک مذہبی سکالر، مفکر، ممتاز اہل قلم اور شاعر ہیں۔گولان نے جدید معاشرتی اور طبعی علوم کے اصول وضوابط اور نظریات کا بھی عمیق مطالعہ کیا۔انہوں نے ترکی میں ایک اسلام پسند تعلیمی تحریک کی بنیاد رکھی۔

محمد فتح اللہ گولان نے اپنے خطبات اور تحریروں میں اکیسویں صدی کا ایسا تصور پیش کیا ہے جس میں ہم ایک ایسی ہمہ پہلو روحانی تبدیلی کا مشاہدہ کریں گے جو خوابیدہ اخلاقی اقدار میں ایک نئی روح پھونکے گی۔ یہ برداشت، فہم وفراست اور بین الاقوامی تعاون کا دور ہوگا۔جو کہ تہذیبوں کے درمیان مکالمہ اور مشترکہ اقدار کی بنا پر ایک مشترک معاشرتی تہذیب کی طرف

راہنمائی کرے گا۔تعلیم کے میدان میں انہوں نے بہت سے فلاحی ادارے بنانے میں سرپرستی کی ہے۔جن کا مقصد نہ صرف ترکی کے اندر بلکہ ترکی کے باہر بھی رفاہ عامہ کے لیے کام کرنا ہے۔انہوں نے عوام کوانفرادی اوراجتماعی طور پراہم مسائل سے آگاہی کے لیے میڈیا خاص طور پرٹیلی ویژن کےاستعمال کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

گولان اس بات پریقین رکھتے ہیں کہ عوام کے لیےانصاف کاحصول،معقول اورمناسب تعلیم پرمنحصر ہے۔صرف اسی صورت میں دوسروں کےحقوق کی حفاظت اوراحترام کامناسب فہم اور بردباری کا جذبہ پیدا ہوگا۔اس مقصد کے لیے انہوں نے سالہا سال سے معاشرے کے سرکردہ افراد اورراہنماؤں ،مضبوط صنعت کاروں اورچھوٹے کاروباری لوگوں کواس بات پر ابھارا کہ وہ تعلیمی معیار بڑھانے میں امداد کریں۔ان ذرائع سے حاصل ہونے والےعطیات سے تعلیمی رفاہی ادارےاس قابل ہوئے کہ وہ ترکی میں اورترکی سے باہر بہت سےسکول قائم کریں۔

گولان کےمطابق جدید دنیا میں آپ ترغیب سےہی دوسروں کواپنے خیالات ماننے کے لیے قائل کرسکتے ہیں۔وہ بیان کرتے ہیں کہ جولوگ اپنے خیالات زبردستی دوسروں پرٹھونسنا چاہتے ہیں وہ عقلی طور پر دیوالیہ ہیں۔لوگ ہمیشہ اپنے معاملات میں طریقہ کار کے انتخاب اوراپنی مذہبی وروحانی اقدار کے اظہارکے لیے آزادی چاہیں گے۔وہ بیان کرتے ہیں کہ جمہوریت اپنے تمام تر نقائص کے باوجوداب واحد پائیدارسیاسی نظام ہےاورلوگوں کوچاہیے کہ وہ جمہوری اداروں کوجدیداورمستحکم بنانے کی کوششیں کریں۔تاکہ ایک ایسامعاشرہ قائم کیاجاسکے جس میں انفرادی حقوق اورآزادی نہ صرف محفوظ ہوں بلکہ ان کااحترام کیاجاتاہو۔جہاں سب کےلیے مساوی مواقع ایک خواب کی طرح نہ ہوں۔

احمد بشیر طاہر

ہوا ہے فیصلہ

ہوا ہے فیصلہ بستی جلائی جائے گی
پھر اس کے بعد شب غم منائی جائے گی

امیر شہر کو رونا ہے جس قیامت پر
کسی غریب کے گھر میں اٹھائی جائے گی

مجھے صفائی کا موقع بھلے ملے نہ ملے
سنا ہے عام عدالت لگائی جائے گی

بُلا کے سامنے کر کے کھڑا کٹہرے میں
میرے خلاف کہانی بنائی جائے گی

یہ داستانِ وفا ہے یہاں نہیں طاہؔر
بروز حشر سنی اور سنائی جائے گی

پروین سلطانہ حناؔ

غزل

ہمارے پاس ہے جتنا، ہمارا کتنا ہے
جو ساتھ جائیں گے لے کے وہ سارا کتنا ہے

ہوا کی طرح گزرتے ہیں ماہ و سال اپنے
یہاں جو وقت گزارا، گزارا کتنا ہے

اسی کے ذکر سے ملتی ہے روح کو تسکیں
اندھیری رات میں اس کو پکارا کتنا ہے

اسی کے فضل و کرم سے گزر رہی ہے حیات
اسی کی ذات کا ہم کو سہارا کتنا ہے

جسے بھی دیکھو ہے مصروفِ روزگار یہاں
زیاں ہے کتنا یہاں پر، خسارا کتنا ہے

ہے آج جس پہ تصّرف وہ وارثوں کا ہے
ہمارا کیا ہے یہاں پر، تمہارا کتنا ہے

وطن کی عزّت و دولت کو لوٹنے والو!
اِسے بتاؤ کہ تم نے سنوارا کتنا ہے؟

اندھیرے دور ہوئے، چاندنی کی دستک سے
مرے نصیب کا روشن ستارا کتنا ہے

حناؔ یہ کشتی بھنور سے ضرور نکلے گی
پہنچ سے دور مری اب کنارا کتنا ہے

ابویحیٰ کی کتابیں

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابویحیٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ابویحیٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

Please visit this link to read all articles and books of Abu Yahya free online.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)